

گذریا

یہ سر دیوں کی ایک تخت بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم بستر میں سر ڈھانپے گھری نیند سورہاتھا کہ کسی نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا۔

”کون ہے؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔ اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے نکلایا اور گھپ انڈھیرے سے آواز آئی۔ ”تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔“

”کیا؟“ میں نے لرزتے ہاتھ کو پرے دھکلینا چاہا۔ ”کیا ہے؟“ اور تاریکی کا بھوت بولا۔ ”تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔ اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔“

”داو جی کے بچے۔“ میں نے روکھے ہو کر کہا۔ ”آدمی رات بخ کرتے ہیں۔ دفع ہو جاؤ۔ میں نہیں آپ کے گھر میں رہتا۔ میں نہیں پڑھتا۔ داو جی کے بچے۔ کتنے!“ اور میں رو نے لگا۔ داو جی نے چکار کر کہا۔ ”اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا؟ پاس نہیں ہو گا تو برا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟“

”اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جانے والے بھی۔ اور میں میں بھی۔ میں بھی۔“ اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا راویا کہ دو ہی لمحوں میں گھکھی بندھ گئی۔

داو جی بڑے پیارے سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”بس اب چپ کر۔ شabaش۔ میرا چھابیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کرو، پھر نہیں جگاؤں گا۔“

آنسوں کا تار ٹو قیارہ تھا۔ میں نے جل کر کہا۔ ”آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے، کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو۔“
”نہیں نہیں۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”میرا تیرا وعدہ رہا، آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا۔ شاباش اب بتا۔“ تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔“

میں نے روٹھ کر کہا۔ ”مجھے نہیں آتا۔“
”فوراً نہیں کہہ دیتا ہے۔“ انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کوشش تو کر۔“

”نہیں کرتا۔“ میں نے جل کر جواب دیا۔
اس پر وہ ذرا ہنسنے اور بولے۔ ”کارکنان گزمه خانہ رانورا تو قیف کر دند۔ کارکنان گزمه خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے، نئی ترکیب ہے، دس مرتبہ کہو۔“

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ملنے والی نہیں ناچار گزمه خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”اب سارا فقرہ پانچ مرتبہ کہو۔“ جب پنجگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑا ہتھے ہوئے کہا۔ ”بھولنا نہیں! صح اٹھتے ہی پوچھوں گا۔“ پھر وہ جدھر سے آئے تھے، ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملائی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بنتے تھے مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب ”کڈو کریلا ڈھائی آنے“ کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف پچے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اوپھا اوپھا جنگلہ تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا، پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیر و زنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پاکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تک ہو جاتی۔ پھر جوں جوں اس کی لمبایی بڑھتی توں

توں اس کے دونوں بازوں بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قبصے میں سب سے لمبی لگی تھی اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جو نہیں میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے ”ٹھامیں“ ہو گا اور میں مر جاؤں گا مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید موچھوں والا ملباس آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ملک کی بڑی سی پگڑی، ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ، کھدر کا ننگ پا ٹجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتمیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھہر کے بغیر گردنوں کو زرازرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب میں اور میرا بھائی ٹھٹھیاں کے جوہڑ سے محچلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قبصہ کو واپس آرے تھے تو نہر کے پل پر بھی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید ٹھیکیا میلی مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا۔ ”داوچی سلام۔“

اور داؤچی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ”جیتے رہو۔“

پچ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے، میں بے حد خوش ہو اور تھوڑی دیر بعد اپنی ٹھٹھی آواز میں چلایا۔ ”داوچی سلام۔“

”جیتے رہو! جیتے رہو!!“ انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر آٹھا کر کہا اور نیرے بھائی نے پناخ سے مجھے زتاٹ کا ایک تھپڑ دیا۔

”یخنی خودے، کتے۔“ وہ چیخا۔ ”جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہربات میں اپنی ننگ پھساتا ہے کہیں۔ بھلا کون ہے وہ؟“

”داوچی۔“ میرے بھائی نے ننگ کر پوچھا۔

”وہ جو بیٹھے ہیں، وہ داؤ جی۔“ میں نے آنسو پی کر کہا۔
”بکواس نہ کر۔“ میرا بھائی چڑھا کیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ ”ہربات میں میری
نقل کرتا ہے کتنا۔ شجی خورا۔“

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی
خوبی تھی کہ داؤ جی سے قوارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپٹ کیوں مارا۔
وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ برا تھا نا اس لیے ہربات میں اپنی شجی بگھارتا تھا۔
داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کر کے گلی سے
اس وقت گزرنے لگا جب وہ آجرا ہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزاہ آتا تھا اور
جواب پا کر اس سے بھی زیادہ ”وہ جیتے رہو،“ کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دوچندی
ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال
بھر یوں نہیں چلتا رہا اور اس اثناء میں مجھے اسی قدر معلوم ہو سکا کہ داؤ جی گیر و رنگی کھڑکیوں
والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے ان کے
متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ برا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑھتے
جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑائے گھڑائے دو فقرے ہوتے
تھے۔ ”تجھے کیا؟“ اور ”بکواس نہ کر؟“ مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجھس کا یہ سلسلہ زیادہ
دریتک نہ چلا۔ اسلامیہ پر انگری سکول سے چو تھی پاس کر کے میں ایم-بی-بائی سکول کی
پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور
اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھڑتی تھے اور قصہ کی منصفی
میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے
ہوشیار تھا۔ اس کی پیڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ میں کی طرح چھوٹا۔
چند لڑکے اسے میاوس کہتے تھے اور باقی نیوالا کہہ کر پکارتے تھے مگر میں داؤ جی کی وجہ
سے اس کو اس کے اصلی نام سے ہی پکارتا تھا۔ اس لیے وہ میرا ذوست بن گیا اور ہم نے
ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بنے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے
ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسادی نے والی دوپہر تھی لیکن

شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بہوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پرواہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔ اسی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف سترہ اور روشن پیٹل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیورٹھی تھی۔ آگے مستطیل صحن، سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلنے مختصری رسوانی تھی۔ گیر و رنگی کھڑکیاں ڈیورٹھی سے ماحقة بیٹھک میں کھلتی تھیں اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیورٹھی میں داخل ہوئے تو اسی چند نے چلا کر ”بے بے نہستے!“ کہا اور مجھے صحن کے پیچوں پیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھیں اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلا تی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا۔ ”بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔“
مشین رُک گئی۔

”ہاں ہاں۔“ بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزوں کی رستی مردڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آگا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ بے بے نے چکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنام بتایا۔

”آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے۔“ اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔ ”ہے نا بے بے؟“

”کیوں نہیں بھائی جو ہو۔“

”آفتاب کیا؟“ اندر سے آواز آئی۔ ”آفتاب کیا بیٹا؟“

”آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی۔“ لڑکی نے رکتے ہوئے کہا۔ ”اتی چند کے ساتھ آیا ہے۔“

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پائچا جامہ چڑھا کرحا اور گھر تا اتارا ہوا تھا مگر سر پر گیڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آگئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ہاں بہت شکل ملتی ہے اور یہ گولو مولوسا ہے۔“ پھر بالٹی فرش پر رکھ کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اور ہاتھ کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

”آفتاب کا خط آتا ہے؟“ انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر کر ناگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”آتا ہے جی۔“ میں نے ہولے نے کہا۔ ”پرسوں آیا تھا۔“

”میاں لکھتا ہے؟“

”پتہ نہیں جی، ابابجی کو پتہ ہے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ”تو اباجی سے پوچھا کرنا!—جو پوچھتا نہیں اُسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔“ میں چپ رہا۔

تحوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”کون سا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟“

”چو تھا۔“ میں نے دوثق سے جواب دیا۔

”کیا نام ہے تیرے سیپارے کا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی پتہ نہیں۔“ میری آواز پھر ڈوب گئی۔

”تک ارسل“ انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھنکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ پہ بے مشین چلاتی رہی، وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزو ان کی ڈوری کھولتا پیش تارہ۔ اسی چند ابھی تک بیٹھ کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرا یوں میں اترتا جا رہا تھا۔ معاد او جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا۔ ”سورہ فاتحہ سناؤ۔“

”مجھے نہیں آتی جی۔“ میں نے شرمende ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”الحمد للہ بھی نہیں

جانتے؟“

”الحمد للہ تو جانتا ہوں جی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے۔ ”ایک ہی بات ہے! ایک

ہی بات ہے!!“ پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا۔ ”سناو۔“

جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پائچامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور گپڑی کا

شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے والا اضافیں کہا تو میرے ساتھ ہی

انہوں نے بھی آمیں کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہا بھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے کیونکہ

پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد للہ سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمیں

کیا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤ جی اسی طرح رہے بلکہ اور

بھی پھر ہو گئے۔ اتنے میں ای چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو

میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا۔ ”داؤ جی سلام۔“ اور انہوں نے دیے ہی

ذوبے ذوبے ہولے سے جواب دیا۔ ”جیتے رہو۔“ بے بے نے مشین روک کر کہا۔

”کبھی بھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آ جایا کر۔“

”ہاں ہاں آ جایا کر۔“ داؤ جی چونکہ کربولے۔ ”آفتاب بھی آیا کرتا تھا۔“ پھر

انہوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا۔“ اور فارسی

کا شعر پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتاں کجھ اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے سخنوار ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تکنی سے کہا۔ ”تو مجھ سے پوچھ تولیتا۔ بے شک آفتاب ان

سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں

ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا، سواب تک نارا نسکی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل

گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا، وہ خفا ہوں گے۔ ”پھر اماں نے ذرا ہمدرد بن کر کہا۔ ”اپنے اب سے اس کا ذکر نہ کرنا۔“

میں اباجی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے۔ ”گولو آگیا۔“ پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے۔ ”کوئی گپ نہ۔“ اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھونڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنتے۔ بس یونہی میرے لئے ہنتے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ سچھ دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجڑ سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے، لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ باتیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا لیکن ان کے خود ساختہ سوال سچھ ایسے لمحے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے۔ ”یہ کیا ہے؟“ ”چٹائی۔“ میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا۔ ”اوں ہوں۔“ وہ سر ہلا کر کہتے۔ ”فارسی میں بتاؤ۔“ تو میں بتک کر جواب دیتا۔ ”لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے۔“ اس پر وہ چکار کر کہتے۔ ”میں پڑھاتا ہوں گولو، میں جو سکھاتا ہوں۔ سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حسیر۔“ میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ ”بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو۔“ مگر وہ شنی ان سُنی ایک کر کے کہے جاتے۔ ”فارسی بوریا عربی حسیر۔“ اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسے بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے۔ اگر چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دون بینک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں خل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے داؤ امی چند پر بھی برابر ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھر رے بے پانی پینے آیا، داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا۔ ”بیٹا ڈو کاناڈاون کیا ہے؟“ اس نے گلاں منہ کے ساتھ لگائے لگائے ”ڈیڈ“ کہا اور پھر گلاں گھڑو نچی تملے پھینک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان

کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہائک لگا کر کہتے۔ ”قرۃ بیٹا یہ چیخی تجھ سے کب چھوٹے گی؟“ اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑھتی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی۔ تو نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں ٹرتے ہیں لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا بنہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں۔ ”اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے۔ ”جالی اس کا مطلب کیا جائیں۔“ اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا، کہتی چلی جاتی۔ پہلے کونے، پھر بد دعا میں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے۔ ”ہوا میں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برنسے کو۔ تم انہیں روکو مت، انہیں ٹوکو مت۔“ پھر وہ اپنی کتاب میں سمیٹتے اور اپنا محبوب حسیراٹا کر چکے سے سیرھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی سے بھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بُری عادت نے عجیب گل کھلانے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن باقیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں نبوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سaba کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوکنے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں مجنون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتنی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ داؤؤں کے علاوہ وہ اپنی طسماتی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویزیوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لیے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کچھ چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی سختی میں میرا ان کے ساتھ ایک معابرہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لیے خالی یوتلیں اور شیشیاں چڑھا کر لاتا اور اس کے بدالے میں وہ بھجے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھرا پے بستر میں دیک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس روکی سے سخت نالاں تھیں۔ اباجی کو میری صحبت بر باد ہونے کا خطرہ لا حق تھا لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے

جان چلی جائے، اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات ٹلسم ہو شربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں نیچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششمہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقع پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر بپاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ، فسانہ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیک میں بند رہتی۔ آخری نیچ پر میں جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔

بائیس میں کا واقعہ ہے کہ صحیح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ ابی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر داش گاہ نے میرا نام بھی ان چھ لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہمپتاں کے رہت کی گدی پر آبیٹھا اور اس گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور کہ ہر جانا چاہیے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمر و عیار کے ہتھنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ بھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ادھر آگئیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی دانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صحیح سوریے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا، کوڑا اور دیوبیب یہ مسجد کے پچھوڑے نال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لا ہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیوبیب یہ نے مجھے بتایا کہ لا ہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خریدی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یہ یہ

نے کہا کہ لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیے اور اس کے سامنے بڑا سائز بورڈ۔ سائن بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنی کے نوٹ لے رہا تھا! میں نے ایک مرتبہ وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا۔ ”یار دیسو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟“ پھر اس نے پلٹ کر دیسو سے پوچھا۔ ”انارکلی میں دفتر بنائیں گے نا؟“ دیسو نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔“

میں نے کہا ”انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکتے ہیں، ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔“ چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بُوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکرنے آکر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلو جی ڈاکٹر صاحب بلا تے ہیں۔“ ”کہاں ہیں؟“ میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ”ہسپتال میں۔“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤ جی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سبھے سبھے داؤ جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا منی۔

”ان کو پہچانتے ہو؟“ اباجی نے سختی سے پوچھا۔

”بے شک!“ میں نے ایک مہذب سیلز میں کی طرح کہا۔

”بے شک کے بنچے، حرامزادے، میں تیری یہ سب۔“

”نہ نہ ڈاکٹر صاحب۔“ داؤ جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ ”یہ تو بہت ہی اچھا بنچے ہے۔ اس کو تو۔“

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تختی سے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے فتنی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ داؤ جی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ ”یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن——“

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کیسی بات کرتے ہو فتنی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔“

”کر لے گا، کر لے گا— ڈاکٹر صاحب۔“ داؤ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ خاطر جمع رکھیں۔“

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”میں سیر کو چلتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ، راستے میں باقیں کریں گے۔“

ابا جی اسی طرح کرسی پر بیٹھنے کے عالم میں اپنار جذر الٹ پلٹ کرتے اور بڑھ رہاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جانی والا دروازہ کھولا تو داؤ جی نے پیچھے مڑ کر کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے گا، ابھی بھجواد تجھے گا۔“

ابا جی نے ویسے ہی چیزیں پڑھتے ”اچھا“ کہا اور داؤ جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤ جی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہ کر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہلے میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے گپڑی اتار کر گود میں ڈال لی، سر پر ہاتھ پھیسر جسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ ”آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اوقل نہ لاسکا تو فرست ڈویژن ضرور دلوادوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مايوس نہیں کیا۔“

”مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی۔“ میں نے گتاخی سے بات کاٹی۔

”تو اور کیا ہو گا گولو؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا ”میں بزنس کروں گا، روپیہ کماوں گا اور اپنی کار لے کر یہاں

آؤں گا۔ پھر دیکھنا۔“

اب کے داؤ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا۔ ”خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک آن پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا۔ نہ ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے جمل کر کہا۔ ”مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی رہیں، میں اپنے یہاں خوش۔“

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”میری بھی پروا نہیں؟“ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے۔ ”میری بھی پروا نہیں؟ او گلو میری بھی پروا نہیں؟“

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کی تو ہے مگر۔“ مگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے۔ ”اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی، اگر میں یہ کفر کا لکھ کہہ جاتا۔ تو۔ تو۔“ انہوں نے فوراً پیڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ ”میں حضور کے دربار کا ایک اونیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک سے بدتر۔ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا۔“ پھر انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے۔ ”میں ذات کا گذریا۔ میرا باپ منڈا سی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابو جہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم، حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو مشی چنت رام بنادیا۔ لوگ کہتے ہیں مشی جی، میں کہتا ہوں رحمۃ اللہ علیہ کا کفش بردار۔ لوگ سمجھتے ہیں۔“ داؤ جی بھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے۔ کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور نیچ نیچ میں فاری کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پیشان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ کہہ رہا تھا۔ داؤ جی! داؤ جی! اور داؤ جی!“ میرے آقا، حضرت مولانا میرے مرشد“ کا وظیفہ کیے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اور پر اٹھا کر بولے۔ ”کیا اچھا موسوم ہے۔ دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشنگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے۔“ پھر وہ پُل کی دیوار سے اٹھے اور بولے۔ ”چلواب چلیں بازار سے تھوڑا سا سودا خریدنا ہے۔“ میں جیسا سرکش و بد مزاںج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ منفعل اور جمل ان کے ساتھ لوٹا۔ کھمے پنساری یعنی دیسوب یہب کے

باپ کی دکان سے انہوں نے گھر یو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر بہت نہ پڑتی۔ ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی بچکچا ہستمانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا رہتا تھا میں ان کے گھر پہنچنے لگا۔ وہاں پہنچنے کریے بھید کھلا کر اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہری کین لائیں بھی رکھی تھی۔

بڑنس میں بننا اور پاپ کرتی پیکار ڈاڑھے پھرنا میرے مقدار میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روائی کے تیرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا ففتر پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داویجی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گر میوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دینے میں۔ کوئی پرانی کھات میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور موئیگ رسول اور مرال کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ٹھیک بتادیا ہے۔ وہ پھر اسی سوال کو دھرا رہے ہیں۔ میں نے پھر ٹھیک بتادیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لاکھڑا کیا ہے۔ میں جاتا اور جھپڑ کر کہتا۔ ”مجھے پتہ نہیں، میں نہیں بتاتا۔“ تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر چلیوں میں اترتی جاتی۔ میں آہستہ سے کہتا۔ ”داویجی۔“

”ہوں!“ ایک گھمیری آواز آتی۔

”داویجی کچھ اور پوچھو۔“

داویجی نے کہا۔ ”بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔ اس کی ترکیب نہیں کرو۔“

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا۔ ”جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے۔ صبح لکھ کر بتا دوں گا، کوئی اور پوچھئے۔“

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کہا۔ ”میرا گلو بہت اچھا ہے۔“

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ”بہت اچھا صفت ہے حرفِ ربط مل کر بنا مند۔“

اور داؤ جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ”جان پدر کیوں تجھے پہلے بھی کہا ہے مندالیہ پہلے بتایا کر۔“

میں نے ترکیبِ خنوی سے جان چھڑانے کے لیے پوچھا۔ ”آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں۔ جان داؤ کیوں نہیں کہتے؟“

”شabaش۔“ وہ خوش ہو کر کہنے لگے۔ ”ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا۔ ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں، سخت غلطی کرتے ہیں اور روز بروز کہو یا دن پر دن اسی طرح

—
اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیبِ خنوی سے بھی خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جماں لے کر پیار سے کہتے۔ ”داو جی اب نیند آ رہی ہے!“
”اور وہ ترکیبِ خنوی؟“ وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا، ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاث پر ایسے ہی بیٹھے رہتے بلکہ اگر کوئی ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پکڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا، ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اس وقت بری لگتی تھیں، وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ، شاید اس لیے کہ اب میں نفیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤ جی پرانے ملائی کتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسرا کھیل کو دے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے، پڑھتا رہے اور جب اس موقق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لیے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا۔ لمبی سیر

اور وہ بھی صح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا بلا کر کہتے۔ ”اٹھ گولو موٹا ہو گیا بینا۔“ ونیا جہان کے والدین صح جگانے کے لیے یہ کہا کرتے ہیں کہ ”اٹھو بینا، صح ہو گئی یا سورج نکل آیا۔“ مگر وہ ”موٹا ہو گیا“ کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے۔ میں منمناتا تو چکار کر کہتے۔ ”بھٹدا ہو جائے گا بینا تو ٹھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا؟“

اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ ”داوُجی خدا کے لیے مجھے صح نہ جگاؤ، چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو۔“

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داوُجی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داوُجی ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیاگر تیں اور داوُجی کو کوئے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بہت غصہ آتا تھا مگر پانی میں رہ کر مگر مجھے سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار وہنا گفتگی کالیوں پر اتر آتیں تو داوُجی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کافیوں پر ہاتھ رکھ کر کر سی پر بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے۔ ”نبیت کرنا بڑا گناہ ہے۔ لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے۔ تیری بے بے بھیارن ہے اور اس کی سرائے میں میں میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی۔ ہم تیوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔“ اور واقعی بے بے بھیارن کی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید۔ ما تھا محرب دار اور آنکھیں چیناں کی۔ چلتی تو ایسی گر بے پائی۔ کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کتنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بیچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر لیکاں ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ ہم دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داوُجی سے پیارا نہ تھا۔ یوں تو بی بی بچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوئٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں۔ داوُجی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رُک کر مجھے دیکھا، پھر منڈیر سے جھانک کر بولی۔ ”داوُجی پڑھ نہیں رہا ہے، تکوں کی چار پائیاں بنار ہا ہے۔“

میں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا۔ ”تجھے کیا، نہیں پڑھتا۔ تو کیوں نہ نہ کرتی ہے۔ آئی بڑی تھانیداری۔“

اور داؤ جی نیچے سے ہائک لگا کر کہتے۔ ”ندنے گلو مولو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔“

اور میں زور سے چلاتا۔ ”پڑھ رہا ہوں جی، جھوٹ بولتی ہے۔“

داو جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے۔ ”قرۃ بینا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جتن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگد گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔“

بی بی کہتی۔ ”کاپی اٹھا کر دیکھ لوداؤ جی، اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔“

میں قہر آلو دنگا ہوں سے نبی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤ جی سمجھاتے کہ ”بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لیے کہتی ہے ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتائی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس، اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلانی چاہتی ہے۔ تیری بہتری چاہتی ہے۔“ اور مجھے داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھنے آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلانی کیونکر چاہ سکتی تھی؟

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل دیتا، گھر جا کر ناشستہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کر اپنی لاٹھیں تیل سے بھرتا اور داؤ جی کے یہاں آ جاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر پر ہی بھجوادیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی، داؤ جی سکول کی گراوئنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھا گیا ہوتا، اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبے میں منصفی کا کام میئنے میں دس دن داؤ جی باقاعدہ کچھ بھری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آ جاتی تھی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا، اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی ننانچ پیدا کرتی تھی۔

چونکہ چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا، اس لیے وہ داؤ جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی۔ ایک دن خلاف معمول داؤ جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچھری بند ہو گئی تھی اور داؤ جی نابالی کے چھپرتے ایک بخ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھایا اور ان کے گلے میں میں نے بانیں ڈال کر کہا۔ ”چلنے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“ انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے۔ ایک آنہ جیب سے نکال کر نابالی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیے۔ میں نے شرات سے ناج کر کہا۔ ”گھر چلنے۔ بے بے کوتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔“

داؤ جی جیسے شرمندگی مانے کو مسکرائے اور بولے ”اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ نگاہ مکھڑا کر دے گی۔ زیادتی پر اُتر آئے گی۔“ پھر انہوں نے کچھ خوفزدہ ہو کر، کچھ ماہوس ہو کر کہا۔ ”اس کی توفیرت ہی ایسی ہے۔“ اس دن مجھے داؤ جی پر بڑا حرم آیا۔ میرا جی ان کے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہئے لگا مگر اس وقت میں نے بے بے سے نہ کہنے کا وعدہ کر کے ہی ان کے لیے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤ جی کے ہاں دودھ، پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤ جی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی بر تاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا تاملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی، وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا سادوں کے جو بڑی میں اشنان کرنے لگی تھی اور گھر میں صرف داؤ جی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤ جی نے کہا۔ ”چلو آج چائے پیں۔ میں دکان سے گڑ لے کر آتا ہوں۔ تم پانی چوہ لہے پر رکھو۔“ بی بی نے جلدی جلدی چوہ لہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤ جی گڑ لے کر آگئے تو انہوں نے کہا۔ ”تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو، چائے میں بنتا ہوں۔“ چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائریکٹ

ان ڈائریکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤ جی چولہا بھی جھوٹکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اوپنے اوپنے بتاتے جاتے تھے۔ ”گلیو نے کہا۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ گلیو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی۔“ پانی اُبل رہا تھا۔ داؤ جی خوش ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں جھوم جھوم کروہ اپنا تازہ بنایا ہوا کبت گارہے تھے۔ ”او گلو! او گلو!! گلیو کی بات مت بھولنا، گلیو کی بات مت بھولنا۔“ انہوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور داؤ جی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گل بُل بُل کے ساتھ گلو گلیو کیے جا رہے تھے۔ میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے، گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبه کی خوشیاں بڑے بڑے رنگیں پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤ جی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فتح ہو گیا۔ چیکٹی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوع کھیل رچانے والا بڑھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داؤ جی نے چوکھے سے اٹھتے ہوئے معدودت بھرے لہجہ میں کہا۔ ”چائے ہے؟“ بے بے نے ایک دو تہڑ داؤ جی کی کمر میں مارا اور کہا۔ ”بڑھے بڑھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار دبھرے تجھے بم سیئیے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھ کو کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں میں کل کی مرتبی آج مردی۔ تیرا من راضی ہو، تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی زیکھا نے میرے پلے باندھ دیا۔ تجھے موت نہیں آتی۔ اول ہوں۔ تجھے کیوں آئے گی۔“ اسی نظرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپا کے داؤ جی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ ”او تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے!“ کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بینھک میں گھس گئے۔ ان کے اس

فرار بلکہ انداز فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی نے بنانہ رہ سکے اور ہماری بھسی کی آواز ایک ثانیہ کے لیے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر نجیگیا لیکن بے بنے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور جیچ کر بولی۔ ”میری سوت! بتا بدھے سے تیرا کیانا طھے ہے؟ بتا نہیں تو ابھی پرانی لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟“ بی بی پچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی انٹھ کر اندر بیٹھک میں کھک آیا۔

داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گد گدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے۔ ”شکر کرو گار کنم کہ گرفتار مہ مصیبتنہ کہ یہ معصیت!“ ہوڑی دیر زک کر پھر کہا۔ ”میں تو اس کے کتوں کا بھی کشا ہوں جس کے سر مطہر پر ملے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔“

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔ ”آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقة بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ و شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نار جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرأت عطا کر، مولاۓ ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔“

میں نے کہا۔ ”داؤ جی آقائے نامدار کون؟“

تو داؤ جی کو یہ سُن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔ ”جان پدر، یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزارنا کر۔ وہ میرا آقا بھی تھے، میرے باپ بھی اور استاد بھی، وہ تیرے دادا استاد ہیں۔ دادا استاد۔“ اور انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

آقائے نامدار کا الفاظ اور کوتاه قسم مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی بھی دیر لگادی کیونکہ ایک ایک فقرے بعد فارسی کے بے شمار نعمتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔ جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔ ”داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں